11128 S.8.6
Title: منبر کا دوسرا نام
Author: امیر حسین چمن
Translator:
Publisher: پرنٹ میڈیا پبلیکیشنز (کراچی، اسلام آباد)
Edition: 5 - اردو - Year: 2002 - Volume:
Pages: 352 - Old Reference:
Id: serial: 11128 shelf: S.8.6

منبر کا دوسرا نام

- ممتاز خطیب حضرت علامہ رشید ترابی کی شخصیت اور خطابت و خدمات پر پہلی، واحد اور مقبول کتاب

جس میں علامہ ترابی کی منتخب تقریریں، تحریریں، کلام اور یادگار تصاویر سب ہی کچھ شامل ہے

امیر حسین چمن

علامہ رشید ترابی کی خطابت کا تجزیاتی مطالعہ

سید منتظر عباس نقوی (ممتاز دانشور، خطیب اور مصنف) اسلام آباد

ڈاکٹر عالیہ امام راوی ہیں کہ جب علامہ رشید ترابی سے یہ پوچھا گیا کہ آپ میں اور ہم (دوسرے مقررین) میں کیا فرق ہے تو انہوں نے کہا تھا 'فرق صرف اتنا ہے کہ ایک منبر کو زینت دیتا ہے' دوسرے کو منبر زینت بخشتا ہے'۔ کسی صاحبِ فن کی طرف سے اپنے بارے میں اس طرح کی رائے کوئی خاص بات نہیں۔ اربابِ فن میں تعلّی اور خودستائی کا پایا جانا بالکل معمول ہے۔ لیکن ان میں سے چند ہی ہوتے ہیں جن کا فرمایا ہوا حقیقتاً مستند ہوتا ہے اور جن کی صریرِ خامہ سچ مچ نوائے سروش ہوتی ہے۔ ترابی صاحب کا قول بھی اسی نوعیت کا اظہار' حقیقت اور خودشناسی پر مبنی جملہ ہے۔ انہوں نے حقیقتاً خطابت کو زینت دی۔ ان کا زمانہ خطابت ان ہی کا دورِ خطابت تھا۔ ان کی منفرد حیثیت کا اندازہ اسی بات سے ہوسکتا ہے کہ اگرچہ وہ اپنے زمانے کے تنہا بڑے خطیب نہیں تھے' مجلسوں کی خطابت کبھی عظمتوں سے تہی داماں نہیں رہی۔ ہر زمانے میں کچھ بڑے مقررین ضرور موجود رہے۔ لیکن اس عہد سے آج تک جب بھی نمایاں خطیبوں کی بات ہوتی ہے تو تمام قابل قدر' قابلِ فخر ذاکرین کے اسمائے گرامی ایک ساتھ لئے جاتے ہیں' ان میں رشید ترابی شامل نہیں ہوتے۔ اور جب رشید ترابی کا نام لیا جاتا ہے تو وہ تمام' یقینی طور پر بڑے نام الگ رکھے جاتے ہیں۔ اس وقت صرف ترابی صاحب کا ذکر ہوتا ہے۔

خطابت کے حسن و کمال کا سب سے بڑا پیمانہ' اس کی مقبولیت اور پذیرائی ہے۔ اس حوالے سے ترابی صاحب دنیائے شہرت و ناموری کے بے تاج حکمران تھے۔ لیکن ترابی صاحب کی انفرادیت کا تعلق اس بات سے نہیں کہ وہ اپنے عہد کے مقبول ترین خطیب تھے۔ مقبولیت ان کا کمال نہیں تھی۔ ان کا کمال ان کا فن تھا۔ مقبولیت اس کمال کا نتیجہ تھی۔ غور طلب' بلکہ تحقیق طلب بات یہ ہے کہ ان کے فن کی وہ کیا خصوصیات تھیں جن کی موجودگی نے ان کے فن کو کمالِ شہرت و مقبولیت تک پہنچایا۔

ترابی صاحب کے پاس وہ تمام خام مال وافر مقدار میں موجود تھا جس کی مدد سے خطابت' اور اچھی خطابت ہوسکتی ہے۔ خداداد صلاحیتوں میں ذہانت' موزوں آواز' اور اچھا حافظہ ایک کامیاب خطیب کے لئے انتہائی ضروری عوامل ہیں۔ یہ تینوں نعمتیں انہیں وافر حاصل تھیں۔ اکتسابی طور پر وہ ایک صاحبِ نظر عالم تھے۔ ان کا مطالعہ نہ یک رخا تھا' نہ محدود۔ انہوں نے بالکل مختلف جہتوں سے تعلق رکھنے والے علوم پر یکساں توجہ دی تھی۔ مشرق اور اس کے علوم تو ان کی میراث تھے ہی' مغربی افکار سے واقفیت بھی کماحقہٗ تھی۔ پھر ان کے سامنے اپنے عہد کے اعلیٰ ترین خطابت کے نمونے بھی موجود تھے۔ ان کا زمانہ وہ ہے

جب سیاست اور مذہب کے میدانوں میں سربلندی اور کامیابی کے لئے خطابت ایک لازمی شرط کی حیثیت رکھتی تھی..... ایک اور صفت جو ہر میدان میں کامیابی کے لئے ہمیشہ ضروری رہی ہے' وہ جذبۂ محنت ہے۔ اتفاقی بڑائیاں حادثہ کے طور پر حاصل تو ہو جاتی ہیں لیکن دیرپا کبھی نہیں ہوتیں۔ تاریخ کا جزوَ بن جانے والے کارنامے اپنی پشت پر لگاتار محنت کا سہارا رکھتے ہیں۔ ترابی صاحب محنتی بھی کافی تھے۔ اور ان کی محنت مسلسل تھی..... اچھی خطابت شعر و ادب کی چاشنی سے مزیّن ہوتی ہے۔ ترابی صاحب کو ایک بہت اعلیٰ درجہ کا ادبی ماحول ملا۔ چنانچہ ان کا شعر و ادب کا ذوق اور آگہی بھی وہ سرمایہ تھی جو ان کے فن کو چار چاند لگانے میں مددگار ثابت ہو سکتی تھی..... یہ تمام عناصر کسی بھی بلند پایہ خطابت کی ضرورت ہیں۔ ترابی صاحب کا فن اور کمالِ فن ان ہی عناصر سے وجود میں آیا ہے۔ لیکن یہ فن محض ان عناصر کے ایک جگہ جمع ہو جانے سے ہی وجود میں نہیں آ جاتا' بلکہ ان سب کو انتہائی چابکدستی' سمجھداری' ہنرمندی اور تناسب و توازن سے استعمال کرنے سے وجود میں آتا ہے۔ اور یہیں سے ترابی صاحب کا فن شروع ہوتا ہے۔

ترابی صاحب کے اپنے زمانے میں بھی' اور ان سے پہلے بھی' خطابت کی تمام تر خوبی مفاہیم کے ابلاغ میں تھی۔ بڑا خطیب وہی تھا جو زیادہ سے زیادہ لوگوں تک اپنے بلند افکار کو پہنچا سکتا ہو۔ چنانچہ خطابت' روزمرّہ کی مثالوں' واقعات اور تشبیہات سے خود کو اس سطح پر لاتی تھی جو سامعین کی بڑی سے بڑی تعداد کو مسئلہ کے تمام پہلوؤں سے آگاہ کر سکے۔ ترابی صاحب نے سب سے بڑا انقلابی اقدام یہ کیا کہ مقصدِ خطابت کو یکسر بدل ڈالا۔ یہ کہنا دشوار ہے کہ ان کے اس فیصلے کے محرکات کیا تھے۔ لیکن یہ ایک ناقابلِ تردید حقیقت ہے کہ ترابی صاحب تقریر بات سمجھانے کے لئے نہیں کرتے تھے۔ ان کی خطابت کا مجموعی تاثر ابلاغ کی بجائے مرعوبیت تھا۔ سامع کو مرعوب کرنا خطابت کے اثرات میں ایک جزوَ کی حیثیت سے ہمیشہ شامل رہا ہے۔ لیکن ترابی صاحب نے اس جزوَ کو' جزوَ سے کل بنا دیا۔ اس مقصد کے حصول کے لئے ان کے سرمایۂ صلاحیت میں ہر کارآمد عنصر موجود تھا۔ وسعتِ معلومات' غیر معمولی حافظہ' لہجے کا تیقّن' ثقیل اور غیر عوامی زبان' مختلف علوم کی خصوصی اصطلاحوں کا ذخیرہ' اور ان سب پر بھاری' ان عناصر کا انتہائی ذہانت سے استعمال۔ نتیجہ یہ ہوتا کہ ان کا سامع تقریر سے زیادہ' مقرر کے سحر میں مسحور ہو جاتا۔ مجمع منتشر ہوتا تو اس احساس کے ساتھ نہیں کہ خطیب نے کیا عمدہ بات کہی ہے۔ بلکہ احساس یہ ہوتا' کیا زبردست خطیب ہے۔' 'کتنا بڑا عالم ہے۔' 'کیا لاجواب حافظہ ہے۔' ترابی صاحب کو سمجھنا حسبِ توفیق چند ہی لوگوں کو میسّر آتا۔ لیکن ایک ہیبت اور حیرت کا احساس ہر سامع کی یکساں اور مشترکہ ملکیت ہوتی۔

ترابی صاحب کے اس مقررانہ اجتہاد کا جواز بھی تھا اور اسی میں ان کی مقبولیت کا راز بھی پوشیدہ تھا۔ جواز تو یہ تھا کہ فکر و خیال میں جتنی بلندی آتی جاتی ہے' اسی تناسب سے ابلاغ میں (بہ اعتبارِ تعدادِ سامعین) کمی ہوتی جاتی ہے۔ ہر صاحبِ فکر و نظر عالم کی طرح ترابی صاحب اس حقیقت سے پوری طرح آگاہ تھے کہ ان کو جس قدر سنا جاتا ہے اس کے مقابلے میں سمجھا بہت کم جاتا ہے' ایسی صورت میں دو تین رائج الوقت امکانات تھے۔ ایک طریقہ تو یہ کہ مقرر عوام کی پسند کو معیار سمجھ لے اور روز بروز اپنی سطح سے نیچے آتا جائے۔ یہ ترابی صاحب تو کیا' کسی بھی معقول شخصیت کے لئے قابلِ قبول حل نہیں تھا۔ پھر یہ کیا جائے کہ خطابت کو کچھ عام فہم موضوعات تک محدود کر لیا جائے' اور ان موضوعات کی حد تک افکار کو مثالوں' تشبیہوں وغیرہ کی مدد سے زیادہ سے زیادہ لائقِ ابلاغ بنا لیا جائے۔ عموماً علماء اور دانشوروں کا یہی طریقہ رہا۔ اور جہاں تک ان کے حقیقی علم و تحقیق کا تعلق تھا' وہ یا تو کوئی اور ذریعۂ اظہار (مثلاً تحریر) تلاش کرتا' یا رفتہ رفتہ بے توجہی کا نشانہ بن کر دم توڑ دیتا۔ ایک اور صورت تھی کہ اپنے مقام پر برقرار رہنے پر اصرار کیا جائے۔ ایسی صورت میں جیسے جیسے فکر و علم میں گہرائی اور گیرائی آتی جاتی' حلقۂ سماعت و فہم محدود سے محدود تر ہوتا جاتا..... ترابی صاحب کے لئے ان تمام صورتوں میں سے کوئی صورت بھی قابلِ قبول نہیں تھی۔ نہ وہ اپنے مقام سے نیچے آنے کے لئے تیار تھے' نہ عددی حوالے سے اپنی مقبولیت پر حرف آنے دینا چاہتے تھے۔ اب یہ تو طے شدہ بات تھی کہ سادہ ترین بات بھی جب ایک ملے جلے مجمع تک یکساں طور پر نہیں پہنچ پاتی تو ترابی صاحب جیسی نابغۂ روزگار شخصیت کے نو بہ نو افکار ہر ذہنی اور فکری سطح کے حامل اجتماع تک کیسے منتقل ہو سکتے تھے۔ چنانچہ انہوں نے گویا طے کر لیا کہ وہ اپنے بیان کو اپنے فکر کی سطح سے نیچے نہیں آنے دیں گے۔ البتہ وہ اپنے ہزاروں سامعین کو مایوس بھی نہیں کریں گے۔ وہ اگر علم و آگہی نہیں لے جا سکتے' نہ سہی' لیکن خالی ہاتھ بھی نہیں جائیں گے۔ وہ یہ احساس لے کر جائیں گے کہ انہوں نے ابھی ابھی ایک حیرت انگیز انسان دیکھا ہے۔ ایک عجوبۂ روزگار شخصیت کی زیارت کی ہے۔ حیرت زدہ ہو جانا بھی تو باعثِ تسکین ہوتا ہے۔ ہر طبقے سے تعلق رکھنے والے اپنے بے شمار سامعین میں سے ہر ایک کو کچھ دے کر رخصت کرنا' یہی وہ بنیادی نکتہ تھا جس نے ترابی صاحب جیسی مشکل پسند شخصیت کو اپنے عہد کا مقبول ترین خطیب بنا دیا۔

ترابی صاحب کی معرکۃ الآرا تقاریر کا پورے غور و توجہ سے معروضی جائزہ لیا جائے تو اندازہ ہوتا ہے کہ وہ اپنے حیرت زدگی اور مرعوبیت کے مقاصد کے حصول کے لئے خصوصی اہتمام کرتے تھے۔ اور اس اہتمام کے لئے نہ تو ان کے پاس ساز و سامان کی کمی تھی' نہ سلیقے اور ہنر مندی کی۔ ان کی خطابت میں موضوع' مواد اور اسے پیش کرنے کے طریقوں میں اتنا تنوع تھا کہ ان کی تقاریر کو کسی بندھے ٹکے

فارمولے میں نہیں سمویا جا سکتا۔ پھر بھی بہت سی تقاریر کو سامنے رکھتے ہوئے کچھ نمایاں خصوصیات کا تعین ہوسکتا ہے۔

ان کا ایک دلچسپ انداز یہ تھا کہ وہ کسی معروف بات کو بیان کرتے ہوئے' عین اس وقت جب سامع یہ توقع کر رہا ہوتا تھا کہ اب وہ فلاں چیز کا ذکر کریں گے' یا فلاں بات کریں گے' اچانک ایسی بات کہہ دیتے جس کا گمان نہ ہوتا۔ انہوں نے امیر المؤمنین علیؑ ابن ابی طالب کے اس خط کا انگریزی زبان میں ترجمہ کیا جو انہوں نے اپنے گورنر مالک ابن اشتر نخعی کی تقرری کے وقت مرکزی حکومت کے ہدایت نامے کے طور پر جاری فرمایا تھا۔ یہ خط بہت معروف ہے۔ اور سب ہی واقف ہیں کہ پورا خط نہج البلاغہ میں موجود ہے۔ اب اس خط کا حوالہ دینا ہو تو ہر شخص توقع کرے گا کہ نہج البلاغہ ہی کا نام لیا جائے گا۔ لیکن ترابی صاحب اس خط کا تعارف یوں کراتے ہیں'

'میں نے ذیل میں حضرت علیؑ کے اس مشہور خط کا عربی سے انگریزی زبان میں ترجمہ پیش کیا ہے جو انہوں نے اس وقت کے مصر کے گورنر مالکِ اشتر کو خلیفہ کی جانب سے ہدایات کے طور پر لکھا تھا۔ فہرستِ طوسی (صفحہ ۳۳) کے مطابق اس خط کی پہلی نقل' حضرت علیؑ کے اپنے دور میں اصبغ ابن نباتہ نے کی تھی۔ اس کے بعد متعدد عرب اور مصری علماً اس خط کو درج کرتے رہے۔ ان میں سرِ فہرست نصر ابن مزاحم (۱۴۸ھ) جاحظ بصری (۲۵۵ھ) سید رضی (۴۰۴ھ)' ابن ابی الحدید (۶۵۵ھ) اور مصر کے مصلح ابن عبدہٗ اور دورِ حاضر کے عظیم دانشور علامہ مصطفٰے بک نجیب شامل ہیں۔'

اب ملاحظہ فرمایئے کہ جس حوالے کی سب سے زیادہ توقع تھی' یعنی نہج البلاغہ' اس کا نام بالکل نہیں لیا گیا۔ نہج البلاغہ کے مرتب سید رضی کا نام ضمناً آ گیا۔ لیکن اس دوران ہر وہ شخص جو سمجھتا تھا کہ وہ اس خط سے اچھی طرح واقف ہے' یہ ماننے پر مجبور ہو گیا کہ وہ ترابی صاحب کے مقابلے میں بے خبرِ محض تھا۔

مندرجہ بالا حوالہ علامہ کی ایک تحریر سے لیا گیا ہے۔ لیکن ان کی تقریر میں بھی یہی رنگ غالب تھا۔ اس خط کا حوالہ دیتے ہوئے انہوں نے اپنی وسعتِ نظر کا گہرا تاثر چھوڑا تھا' کبھی یہی کام وہ اپنے حافظے کی صلاحیت سے لیتے۔ آہستہ آہستہ دھیمے دھیمے لہجے میں بات شروع ہوتی' پھر کوئی خاص تذکرہ شروع ہوتا' غیر محسوس انداز میں ان کا حافظہ اپنے جوہر دکھانا شروع کرتا' ان کے بیان کی روانی بڑھتی جاتی' کچھ دیر بعد سامع حیران ہونا شروع کرتا' ایک سناٹا طاری ہو جاتا' سانس رک جاتی' اور جب تک بات اپنے نقطۂ کمال تک پہنچتی' موضوع بیان سے قطع نظر' سامع صرف حافظے کی بے پناہ قوت کے سامنے گھٹنے ٹیک چکا ہوتا۔ اپریل ۱۹۷۰ء میں ماہ محرم کے تیسرے عشرے کی مجالس ترابی صاحب امام بارگاہ رضویہ میں پڑھ رہے تھے۔ ان دنوں آیت اللہ العظمٰی سید محسن حکیم طباطبائی مرحوم کے فرزند

آقائے مہدی حکیم پاکستان تشریف لائے تھے۔ ۲۹ محرم کی مجلس میں انہوں نے بھی شرکت کی۔ ترابی صاحب نے معزز مہمان کا منبر سے تعارف کرایا۔ طباطبائی سادات کے متعلق چند جملے کہے۔ پھر کہا میں ایک حدیث بیان کرنا چاہتا ہوں' پھر بڑے غیر محسوس انداز میں' آقائے محسن حکیم کے سلسلۂ اجازۂ روایتِ حدیث کا بیان شروع کیا؛

'ایک حدیث کو نقل کروں۔ اس سے پہلے بھی کبھی میں نے اس طرح سے گفتگو کی تھی۔ آج تو مجھے افتخار ہے' شرف ہے' کہ اس گھرانے کے لئے مَیں' اس چیز کو پیش کروں۔ سرکارِ مہدیٔ طباطبائی' فرزند ہیں آیت اللہ محسنِ حکیمِ طباطبائی کے' جن کی ولادت ۱۳۰۶ھ میں ہوئی۔ ہزار و سہ صد و شش؛ اور عیدِ فطر کو پیدا ہوئے۔ عید کا دن تھا' شب مبارکِ رمضان کی' جب وہ پیدا ہوئے۔ اللہ ان کو سلامت رکھے۔ محسنِ حکیمِ طباطبائی آیت اللہ العظمیٰ' شاگرد ہیں اور نقل کرتے ہیں روایت کو' اپنے شیخِ اجازہ میرزا نائینی سے۔ جن کا سنہِ وفات ۱۳۵۵ھ ہے۔

میرزا نائینی روایت کرتے ہیں' تمام اپنے احادیث کے سلسلے کو' سرکارِ مرزائے بزرگِ سامرّہ سے جن کا سنہِ وفات ۱۳۱۲ھ ہے۔

سرکارِ میرزا روایت کرتے ہیں شیخِ مرتضائے انصاری سے' جن کا سنہِ وفات ۱۲۸۱ھ ہے۔

شیخ مرتضائے انصاری روایت کرتے ہیں ملّا احمد مراقی سے۔

ملا احمد مراقی روایت کرتے ہیں مرزا مہدیٔ بحرالعلوم طباطبائی سے۔

مرزا مہدیٔ بحرالعلومِ طباطبائی روایت کرتے ہیں علامہ باقرِ بہبہانی سے۔

وہ روایت کرتے ہیں اکملِ بہبہانی سے۔ وہ روایت کرتے ہیں ملا باقرِ مجلسی سے۔

وہ روایت کرتے ہیں ملا تقی مجلسی سے۔ وہ روایت کرتے ہیں اپنے استاد بہاالدینِ عاملی سے

بہاالدینِ عاملی روایت کرتے ہیں اپنے والد حسین ابن الصمدِ عاملی سے۔

وہ روایت کرتے ہیں شہیدِ ثانی زین الدین سے۔ وہ روایت کرتے ہیں عبدالعالی میسی سے۔

وہ روایت کرتے ہیں داؤدِ جزینی سے۔ وہ روایت کرتے ہیں علی' شہیدِ اوّل کے بیٹے سے۔

وہ روایت کرتے ہیں محمد ابنِ مکّی شہیدِ اوّل سے۔ وہ روایت کرتے ہیں فخرالمحققین محمد ابنِ علامہ حلّی سے' وہ روایت کرتے ہیں اپنے پدرِ گرامی علامہ حلّی سے۔

علامہ حلّی روایت کرتے ہیں اپنے استاد محققِ حلّی سے۔ محقّق حلّی روایت کرتے ہیں اپنے استاد ابنِ وہب حلّی سے۔

وہ روایت کرتے ہیں فقّار ابنِ معادِ موسوی سے۔ وہ روایت کرتے ہیں شاذان ابن جبرئیلِ قمّی

سے۔ وہ روایت کرتے ہیں ابوالفضلِ حسنِ طبرسی سے۔

وہ روایت کرتے ہیں ابوعلیٰ طوسی سے۔ وہ روایت کرتے ہیں شیخ الطائفہ محمد ابنِ حسن طوسی صاحبِ تہذیب واستبصار سے'

وہ روایت کرتے ہیں شیخِ مفید سے۔ وہ روایت کرتے ہیں شیخِ صدّوق سے۔ شیخ صدوق روایت کرتے ہیں اپنے والدِ گرامی شیخ علی صدّوق سے۔ وہ روایت کرتے ہیں علی ابراہیم سے۔ وہ روایت کرتے ہیں ابراہیم ابن ہاشم سے۔

وہ روایت کرتے ہیں رعیّہ ابن شبیب سے کہ امام رضاؑ نے فرمایا۔۔

(یہاں تک پہنچ کر ترابی صاحب رکے تو دم سادھے مجمع اچانک پھٹ پڑا اور داد و تحسین کا طوفان امنڈ پڑا)۔

امام رضاؑ روایت کرتے ہیں امام موسیٰؑ ابن جعفرؑ سے۔ امام موسیٰؑ ابنِ جعفرؑ روایت کرتے ہیں امام جعفرِ صادقؑ سے۔ امام جعفرِ صادقؑ روایت کرتے ہیں امام باقرؑ سے۔

امامِ باقر روایت کرتے ہیں امامِ زین العابدینؑ سے۔

امام زین العابدینؑ روایت کرتے ہیں حسینؑ ابنِ علیؑ سے کہ انہوں نے فرمایا کہ میرے نانا نے میرے باپ کو دیکھ کر فرمایا کہ

"یا علی اَنتَ المَثَلُ الاَعلی"

.....

کبھی سمندر کے ساحل پر کھڑے ہو کر موجوں کا تماشہ دیکھیئے۔ ایک لہر اٹھی۔ تیزی سے کنارے کی طرف بڑھی۔ محسوس ہوا' ساحل پر تا دور چڑھتی آئے گی۔ اتنے میں دور سے ایک اور بلند موج اٹھی۔ دوسری لہر کی گھن گرج نے پہلی کے انجام سے لاتعلق کر دیا' اب نظریں دوسری پر جمی ہوئی ہیں۔ یہ کھیل مسلسل جاری رہتا ہے۔ ہر دوسری لہر اس جاہ وجلال سے اٹھتی ہے کہ پہلی کا انجام دیکھنے کی نوبت ہی نہیں آتی۔ ترابی صاحب کی ساری تقریر کچھ ایسی ہی کیفیت کی حامل ہوتی۔ وہ بات کو اچانک شروع کرتے۔ بڑی بلند آہنگ کے ساتھ' خیال تیزی سے آگے بڑھتا۔ اور عین اس مرحلے پر' جہاں کوئی دوسرا ہوتا تو اپنا پورا زورِ بیان صرف کر دیتا' جہاں وہ ٹھہر کر' فضا بنا کر' سامعین کو متوجہ کر کے' نتیجے کا جملہ اس اہتمام سے کہتا کہ مجمع داد دینے پر مجبور ہو جاتا' ایسے تمام مراحل پر اپنی جاری گفتگو کا سلسلہ توڑ کر فوراً کسی دوسرے خیال کی طرف بلا لیتے۔ یوں کہیئے کہ ترابی صاحب پیاس بجھانے کے نہیں' پیاس بھڑکانے کے قائل تھے۔ وہ عمداً یہ کوشش کرتے کہ سننے والا سیر نہ ہونے پائے۔ ان کی کوئی تقریر سماعت

فرمایئے۔ جس قدر توجہ اور انہماک سے سنیں گے اسی قدر یہ احساس ہوگا کہ کاش وہ ذرا سی وضاحت اور کر دیتے' کاش چند جملے اور کہہ دیتے۔ ترابی صاحب کا یہ وہ مستقل انداز ہے جس کی وضاحت کے لئے مثالوں کی ضرورت نہیں ہے۔ کوئی تقریر کہیں سے سنئے۔ یہ رنگ چھلکتا نظر آئے گا۔ ایک مثال ملاحظہ ہی فرمالیں۔ موضوعِ خطاب قیامت ہے' دورانِ تقریر سورۂ تحریم کی آٹھویں آیت کی تلاوت کی' اس کا ترجمہ بیان کر رہے ہیں۔

''یہ وہ دن ہوگا جب اللہ اپنے نبی کو رسوا نہ ہونے دے گا۔ رسوائی کس بات کی ہوتی ہے؟ مطلب یہ کہ جس جس سے وعدہ کیا ہے وہ وعدہ پورا ہوگا۔ کوثر پر لے جانے کا وعدہ کیا ہے۔ وہ پورا ہوگا۔ جنت میں لے جانے کا وعدہ کیا ہے وہ وعدہ پورا ہوگا..... وہاں صاحبانِ ایمان ساتھ ہونگے۔ کس شان کے ساتھ ہوں گے؟ ان کا نور کبھی داہنی جانب چلے گا' کبھی سامنے دوڑے گا' وہ کہتے جائیں گے پروردگار! ہمارے نور کو اور کامل کر دے۔ یہاں دیوانے کہتے یہ ہیں کہ نبی کو نور نہ کہو۔۔۔ قیامت کے دن ہر مومن کا نور ہے۔ اور ایسے موقعے پر نبیؐ کی سواری چلی۔''

اسی تقریر میں بات آگے بڑھی۔ چند اور آیات کی تلاوت کی۔ ترجمہ بیان کیا اور پھر صحیح بخاری کی ایک حدیث کا ذکر شروع کیا۔

''مقامِ محمود پر تشریف فرما ہیں پیغمبرؐ۔ اور بخاری کہتے ہیں' وہاں سے نظر پڑے گی محشر کے میدان پر۔ اب یہ سورۂ مائدہ کی تفسیر ہو رہی ہے۔ (خیال رہے کہ اس تقریر کے دوران انہوں نے سورۂ مائدہ کی کسی آیت کی تلاوت نہیں کی تھی) وہاں سے پیغمبرؐ دیکھیں گے کہ کچھ لوگ جہنم کی طرف جا رہے ہیں' پیغمبرؐ ان کو پہچان جائیں گے۔ اور کہیں گے پروردگار! یہ تو دنیا میں میرے ساتھی تھے' یہ میرے اصحاب ہیں۔ ملائکہ کہیں گے اللہ کے رسولؐ آپ کو علم ہے آپ کے بعد کیا ہوا؟ رسولؐ کہیں گے' تو غفار ہے' تو بخشنے والا ہے' جو چاہے کرے۔ تفصیل بعد میں۔۔۔ پیغمبرؐ مقامِ محمود پر ہیں۔''

مندرجہ بالا دونوں اقتباس ان کی ایک تقریر کے دو مختصر سے جزو ہیں۔ ان میں خط کشیدہ جملوں کو ملاحظہ فرمایئے۔ ہر جملہ تفصیل کا تقاضہ کر رہا ہے۔ لیکن ترابی صاحب سامع کی فکر کو مہمیز کر کے فوراً آگے بڑھ جاتے ہیں۔ وہی ایک گھونٹ پلا کر' یا جرعۂ آب دکھا کر پیاس بھڑکانے کا انداز۔

لیکن یہ ادھوری باتیں اپنے نفسیاتی اثرات کے اعتبار سے بہت اہمیت رکھتی تھیں۔ بات اگر ہر اعتبار سے مکمل ہو جائے تو سامع مطمئن ہو جاتا ہے۔ لیکن یہ اطمینان سنی ہوئی بات کو فراموش کر دینے کا سبب بنتا ہے۔ اس کے مقابلے میں اگر کوئی بات جذبۂ تجسس کو بیدار کر سکے تو وہ جواب کی تلاش میں بار بار ذہن کے پردے پر ابھرتی رہتی ہے۔ اس طرح ذہن میں بات کی جڑیں گہری ہوتی جاتی ہیں۔ پھر

تفصیل میں جائے بغیر صرف اشارات پر اکتفا کرنا' سامع کو لاشعوری طور پر خطیب کے تبحر علمی کا یقین دلاتا ہے۔ ایسے مرحلے پر احساس ہوتا ہے کہ کہنے والا کہنے کے لئے بہت زیادہ مواد رکھتا ہے۔ یہ اپنا اور ہمارا وقت ضائع نہیں کر رہا۔ اور ظاہر ہے کہ ایسا احساس خطیب کے لئے احترام و عقیدت کے جذبات بڑھا دیتا ہے۔ پھر ان جملوں میں بعض مقامات ایسے ہیں کہ دوسرا خطیب اس بات کو پوری طرح پھیلا کر' سجا کر ادا کرتا تو مجمع بے ساختہ داد و تحسین کی صدائیں بلند کرتا۔ لیکن یوں لگتا ہے کہ ترابی صاحب بہت سے موقعوں پر عمداً اپنے سامعین کی داد دینے کی خواہش کو دباتے رہتے تھے۔ ذہن کی گہرائیوں سے داد چلتی' لیکن صدائے تحسین بننے سے پہلے' ترابی صاحب بات کا رخ موڑ چکے ہوتے۔ اس تکنیک کا فائدہ یہ تھا کہ زور شور سے دی جانے والی داد میں صرف ہونے والی توانائی جذبۂ ستائش کو دوام بخشنے میں صرف ہوتی۔ اور یا پھر جس مقام پر وہ خود داد لینا چاہتے' وہاں لگاتار دبائی جانے والی یہ داد' ایک دھماکے سے پھٹ پڑتی۔

دورانِ تقریر' برمحل اشعار تقریر کے حسن کو چار چاند لگا دیتے ہیں۔ ترابی صاحب بھی اشعار پڑھتے تھے اور خوب پڑھتے تھے۔ لیکن ان کے پڑھے ہوئے اشعار' حسنِ بیان کے لئے کم اور جزوِ مضمون کے طور پر زیادہ ہوتے تھے۔ وہ اکثر اشعار سے تقریر سجانے کی بجائے' تقریر بنانے کا کام لیتے تھے۔ لیکن شعر خوانی کے ہر مرحلے پر ان کا یہ اہتمام' پورے اہتمام سے برقرار رہتا کہ جو شعر نہیں سمجھیں گے' نہ سمجھیں' لیکن خالی ہاتھ نہ جائیں۔ کچھ تو انہیں ملے' سرمایۂ حیرت و استعجاب سہی' چنانچہ یہ سارا عمل اشعار کے انتخاب سے شروع ہو جاتا۔ انہوں نے اپنی تقاریر میں عربی فارسی کے علاوہ' اردو کے تقریباً تمام اساتذہ کا کلام پڑھا ہے۔ میرؔ' غالبؔ' اقبالؔ' یگانہؔ' انیسؔ' دبیرؔ۔ یعنی وہ تمام شعرا جن کے نام اور کلام دونوں بہت معروف ہیں۔ لیکن التزام یہ تھا کہ ان شاعروں کے اُن اشعار کو کبھی نہیں پڑھا جو زباں زدِ عام ہیں۔ وہ تلاش و جستجو سے ایسے اشعار لاتے جو ادب کے عام طالب علم کی نگاہ سے بھی اوجھل ہوتے۔ اس کے لئے ایک تو وہ ان اساتذہ کے فارسی کلام کو کثرت سے پڑھتے' اور اگر اردو شعر پڑھتے تو وہ بھی سامنے کا شعر نہ ہوتا۔ اور اگر اتفاق سے کبھی کوئی معروف شعر پڑھا بھی تو اس کے معنی میں وہ ندرت پیدا کی کہ جانا پہچانا شعر بھی اجنبی بن گیا۔ ۱۹۶۹ء میں غالبؔ کی صد سالہ برسی منائی جا رہی تھی۔ سال کے ابتدائی مہینوں میں ایامِ عزا آ گئے۔ خالق دیناہال میں ترابی صاحب کتاب' حکمت اور ملکِ عظیم' کے عنوان سے عشرہ پڑھ رہے تھے؛ ابتدائی تین تقاریر میں انہوں نے غالبؔ کا تذکرہ کرتے ہوئے پہلی مجلس میں ان کے بیس اشعار سنائے۔ ان میں سے ۱۴ فارسی کے تھے اور چھ اردو کے۔ اگلے دن غالب کے نو اشعار کا حوالہ دیا' ان میں سے بھی فارسی کے پانچ اور اردو کے چار تھے۔ تیسری تقریر میں چار اشعار پر اکتفا کی' ان میں اردو

کے زیادہ تھے یعنی تین اور ایک کی نسبت تھی..... مدحِ امیر المؤمنینؑ میں غالبؔ کا ایک شعر بہت مشہور ہے'

غالبؔ ندیمِ دوست سے آتی ہے بوئے دوست
مشغولِ حق ہوں بندگیٔ بو ترابؑ میں

دلچسپ بات یہ ہے کہ پڑھے گئے ۱۳۳ اشعار میں سب کچھ تھا' بس یہی ایک شعر نہیں تھا۔

کبھی یوں بھی ہوتا کہ کسی شاعر کا فقط ایک شعر پڑھنا مقصود ہوتا' تو پہلے غزل کا مطلع پڑھتے' پھر اسی غزل کے دو تین اور غیر متعلق اشعار پڑھتے' تب اصل شعر کی باری آتی۔ اس نوعیت کے مظاہرے آیات کی تلاوت کے دوران بھی ہوتے۔ مثلاً ایک آیت پڑھی' کہا یہ آیت سورۂ یٰسین سے ہے۔ سورۂ یٰسین چھتیسویں سورہ ہے' اس سے پہلی پینتیسویں سورہ فاطر ہے' چونتیسویں سورۂ سبا ہے اور تینتیسویں سورۂ احزاب ہے۔۔۔ اسی طرح ایک آیت پڑھی کہا ''یہ سورۂ ابراہیم سے ہے' اس سے پہلے کی دو آیتیں ہیں'' یہ کہہ کر وہ بھی پڑھ دیں اس کے بعد یہ کہہ کر آگے بڑھ گئے کہ ''ان آیات پر ان کے محل پر گفتگو ہوگی' یہاں تو یہ بتانا ہے کہ جسے ذوقِ مطالعۂ قرآن ہے وہ دیکھ لے کہ ہم نے کہاں سے آیت لی ہے''۔۔۔ ظاہر ہے کہ اس نوعیت کے تمام مظاہروں کا مقصد اپنے سامعین کو یہ یقین دلانا ہوتا تھا کہ تم خطیب کے علم اور معلومات پر پورا بھروسہ رکھو' وہ تمہارے سامنے جو کچھ بیان کر رہا ہے وہ ادھر اُدھر سے اٹھایا ہوا فقط ایک جملہ نہیں بلکہ اپنی دسترس میں موجود اور محفوظ خزانے سے ایک نادر جواہر پارے کا انتخاب ہے۔

جب تقریر میں اشعار نفسِ مضمون کی حیثیت سے پڑھے جائیں تو ان کی تشریح و توضیح ضروری ہو جاتی ہے۔ ترابی صاحب' مجالس کے دوسرے خطباء کے مقابلے میں بہت زیادہ اشعار پڑھتے تھے۔ لیکن شعر کی تشریح کے باب میں بھی انکا انداز منفرد تھا۔ وہ شاعر کو اس کی سطح پر جا کر سمجھتے تھے۔ اور پھر معنی بیان کرتے ہوئے بھی وہی سطح برقرار رہتی۔ درسی انداز کی تشریح تو بہت دور کی بات ہے' وہ غالباً اسے بھی شاعر کی توہین سمجھتے تھے کہ شعر کو عوامی سطح پر لا کر سمجھایا جائے۔ شعر علامتی اور اشاراتی ذریعۂ اظہار ہے۔ ترابی صاحب شعر کی تشریح بھی اشاراتی انداز سے بیان کرتے۔ ان کے نزدیک جو شعری ذوق نہیں رکھتا وہ اس کے طرزِ ادا سے محظوظ ہو لے۔ لیکن جہاں تک شعر کی معنویت کے مزے اٹھانا ہے' وہ صرف اور صرف انکا حق ہے جو سخن فہم کہلا سکیں۔ چنانچہ بارہا وہ بغیر اس بات کو خاطر میں لائے ہوئے کہ شعر عربی کا ہے' فارسی کا ہے یا اردو کا ہے' اس کے معنی بیان ہی نہیں کرتے تھے اور جب کبھی معنی بیان کرتے تو گویا مفہوم نہیں بتا رہے ہیں بلکہ شعر پر با آوازِ بلند غور کر رہے ہیں۔ اور غور بھی اس حوالے سے کہ اس کا موضوعِ گفتگو سے کیا ربط ہے۔ ملاحظہ فرمائیے۔

علیؑ کا بندہ ہو کر بندگی کی آبرو رکھ لی
یگانہ کے لئے کیا دور تھا منصور ہو جانا

مقامِ عمل ایک منزل ہے۔ جہاں انسان اس حد تک پہنچ جائے' جہاں دار و رسن ہے۔ اور یہ منزلِ دار و رسن پر گفتگو نہیں ہے۔ حیاتِ طیّبہ کا کوئی مقام ایسا نہیں ہے جہاں انسان حدوں کو توڑ کر آگے جائے۔ حدیں ہیں' حدوں میں زندگی ہے' یہ طہارت ہے' یہ نجاست ہے' یہ حلال ہے' یہ حرام ہے' یہ جائز ہے' یہ ناجائز ہے' یہ نجس ہے' یہ طیّب ہے۔ ان حدود پر نظر رہے"۔

"معلوم ہوا حالِ شہیدانِ گزشتہ
تیغِ ستم آئینۂ تصویر نما ہے

ظلم بھی مسلسل ہے' عدل بھی مسلسل ہے' گناہ بھی مسلسل ہے' عصمت بھی مسلسل ہے' حق بھی مسلسل ہے' باطل بھی مسلسل ہے۔ سلسلے بندھے ہوئے ہیں۔"

"سوزشِ باطن کے ہیں احباب منکر' ورنہ یاں
دل محیطِ گریہ و لب آشنائے خندہ ہے

ترجمہ کر دیا قولِ امیر المؤمنینؑ کا۔ (غالبؔ) فکر کو کہاں سے لے رہے ہیں؟"

ترابی صاحب کی خطابت میں' سب سے گراں قدر خصوصیت ان کی غیر معمولی' ہمہ وقت بیدار و مستعد ذہانت تھی۔ ان کی ذہانت کا پہلا قدم وقت کے تقاضے کو سمجھنے کے لئے اٹھتا۔ اور وقت کے تقاضے میں مجلس کے خصوصی مقامی ماحول سے لے کر بین الاقوامی صورتِ حال تک' ہر پہلو پیشِ نظر ہوتا۔ شہر میں کیا ہو رہا ہے' ملک کے حالات کیا ہیں' دنیا کی رفتار کیا ہے..... پھر مجلس کہاں ہو رہی ہے' مجمع کی ذہنی کیفیت کیا ہے' ان کی تقریر سے پہلے مجمع کسی اور کے کمالِ فن کے تاثر کے تحت تو نہیں ہے' مجمع میں کون کون بیٹھا ہے..... پھر ان بیٹھے ہوؤں میں سے کسی کا اکرام مقصود ہے' کسی کا تعارف کرانا ہے' کسی کی سرزنش کرنی ہے' کسی کا شکریہ ادا کرنا ہے' کسی کو متاثر کرنا ہے..... غرض ایک ایک پہلو کا جائزہ لے کر' اپنی ترجیحات کا تعیّن کر کے وہ منبر پر آتے۔ اور پھر ان کی ذہانت نئے انداز سے جلوہ گر ہوتی۔ وہ اپنے مقررہ اہداف کو نشانہ بنانا شروع کرتے۔ لیکن کیا مجال کسی کو ان کے اصل ہدف کا پتہ چل سکے۔ مجمع جملوں کے صرف اسی رخ کو دیکھتا رہتا جو ترابی صاحب خود دکھا رہے ہوتے' لیکن نتیجہ اس مقصد کا حصول ہوتا' جس کے لئے بات کی جا رہی ہوتی۔ ان کی اس نوع کی صناعی اور کاریگری کے اتنے رخ ہیں کہ ان سب کا احاطہ مشکل ہے۔ محض وضاحت کے لئے یہی ایک پہلو دیکھ لیجئے کہ' جیسا کہ عرض کیا جا چکا' ان کا اصل فن اپنے سامع کو مرعوب اور محوِ حیرت کر دینا تھا' انہوں نے یہ مقصود بھرپور طور پر حاصل کیا۔ لیکن دورانِ تقریر

سامع صرف انکے علم' ان کی معلومات' ان کے نکات سے دامن بھر رہا ہوتا۔ یہ تو اسے بعد میں بھی پتہ نہ چلتا کہ دراصل اس کے حصے میں خطیب کے لئے صرف جذبہء تحسین اور اعترافِ عظمت آیا ہے۔

جو کچھ عرض کیا گیا یہ ایک نامکمل گفتگو ہے۔ ابھی کئی اور گوشے قابلِ ذکر ہیں۔ سب سے بڑی بات یہ کہ' یہ ساری گفتگو ان کی تقریر کے صرف اس حصّے سے تعلق رکھتی ہے جو ضابطۂ تحریر میں آ سکتا تھا' ابھی ان کے انداز بیان' لہجے' الفاظ کا دروبست' منبر پر نشست' دورانِ تقریر ہاتھوں کی جنبش' چہرے کا اتار چڑھاؤ..... یہ سب تو زیرِ بحث آیا ہی نہیں۔ اور ان کی خطابت میں لائقِ تحریر عبارت کے مقابلے میں اِن عوامل کا کتنا دخل ہے' اس کا اندازہ انہیں کے الفاظ سے لگایئے۔

''ہمیشہ یہ بات یاد رکھیئے' تقریر اور ہوتی ہے' کتاب اور ہوتی ہے۔ کبھی کبھی تقریر میں ایک اشارہ ایک جملے کا کام کر جاتا ہے۔ جس کو کتاب برداشت نہیں کر سکتی۔''

تو یہ ساری بات صرف کتابی حصّے پر گفتگو ہے۔ ابھی اشاروں میں کہے گئے جملوں کا حسن' اپنی دریافت کے لئے کسی صاحبِ نظر کا منتظر ہے۔ خطابت کے فن سے معمولی دلچسپی رکھنے والوں کے لئے قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ فنکار دنیا سے جاتا ہے تو اس کی شخصیت بھی ساتھ چلی جاتی ہے۔ اور جب شخصیت نہ رہے تو اس کے ساتھ کے تمام حوالے' تمام تاثرات بھی رفتہ رفتہ ختم ہو جاتے ہیں۔ اس کی جدائی میں سنائی دینے والی سسکیاں اور آہیں' اس کی یاد میں بہنے والے آنسو سب ختم ہو جاتے ہیں۔ البتہ عظیم فنکار کا فن باقی رہ جاتا ہے۔ اب لفظِ ترابی ایک فن کے نقطۂ کمال کا علامتی اظہار ہے۔ اب ترابی صاحب کے فن کو جاننے' دیکھنے اور سمجھنے کی وجہ یہ نہیں کہ اس طرح ترابی صاحب کو زندہ رکھنا مقصود ہے۔ بلکہ ان کی خطابت معیارِ فن ہے۔ اگر اس فن کو سمجھنا ہے اور اس کی کامیابی کے قواعد وضوابط مرتّب کرنے ہیں تو ترابی صاحب کی خطابت کا تجزیاتی مطالعہ جاری رہنا چاہیئے۔

.....

یقین کا گھرانہ

''.....رسولؐ اللہ کا یہ گھرانہ یقین کا گھرانہ ہے' یہ صدق وعدالت کا گھرانہ' اور اس گھرانے کی کیفیت ہی یہ ہے کہ جہاں بے یقینوں کو یقین عطا ہو' اس منزل پر بیقرار ہو کر اقبالؔ نے ایک عجیب فیصلہ کیا: ؎

''اُنکہ بخشد بے یقیناں رایقین ☆ اُنکہ لرزداز مجودِ او زمین''

وہ انسان جو بے یقینوں کو یقین عطا کرتا ہے۔ یہ وہ انسان ہے جس کے سجدے سے زمین کانپتی ہے۔ ''لاَ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ کی تلوار کے سائے میں جس کا خون بہے تو اُس کے خون کی بوند سے آواز آئے 'لاَ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ یہی وہ حسینؑ ہے جو بے یقینوں کو یقین بخشتا ہے''۔